ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجئے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

آج کسی کو وجدان ملنے کا دن ہے۔

کتنے گیانی بیٹھے ہیں جو اس چشمے سے فیض یاب ہوتے رہے ہیں موسم اگرچہ رائیگانیوں کا ہے۔

ہم سب اپنے اپنے نظریات کے کھنڈرات سے ہوتے ہوئے اس Rendezous رینڈے زو تک پہنچے ہیں۔

یہ سرزمین Being ہستی کے ناہموار مرحلوں سے گزر کر اب Nothingness کے خلا سے گزر رہی ہے، پیکر کروڑوں کی تعداد میں گھوم رہے ہیں لیکن ان کی روحیں چھین لی گئی ہیں۔

ضمیر آئی ایم ایف کے پاس گروی رکھ دیے گئے ہیں۔

پالیسیاں بنانے پر مامور کھلے ذہن کھوکھلے کر دیے گئے ہیں۔

ایسے میں ہم ایک ایسے جوان رعنا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے جمع ہیں جس نے وہی راہیں چنی ہیں جو مقتل سے گزر کر جاتی ہیں اور جو اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کرنے میں کامیاب رہے ہیں اور اب سفر کے دوران ہی سستاتے ہوئے اپنی لہلہاتی فصلوں کو یاد کر رہے ہیں۔

خواتین وحضرات! مقتل ایسے لوگوں کی نشست و برخاست سے قابل دید مقامات میں شامل ہو جاتے ہیں جہاں خود کو تلاش کرنے والے بلوچ سندھی پنجابی پشتون کشمیری گلگتی مہاجر اپنی امڈتی حسرتیں اور مچلتے خواب لے کر پہنچتے ہیں کچھ خود کو پا لیتے ہیں مگر دنیا کی نظر میں لاپتا ہو جاتے ہیں۔

میں آج مبارک باد دینا چاہوں گا آج کے دولہا کو کہ اس قریۂ سفاک میں ریاست

ناپرساں میں آٹھ دہائیاں بہت اعتماد سے خلوص سے اور جہد مسلسل میں گزارنے پر ۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک دل دردمند رکھنے پر اور اس کی تواتر سے حفاظت کرنے پر۔ حالانکہ اس نو آزاد ملک میں اور بھی بہت سے آپشن تھے کمانے کے بھی اور آگے بڑھنے کے بھی۔ جنرل بھی بن سکتے تھے۔سی ایس ایس کر سکتے تھے۔دل کی جگہ سینے میں پتھر رکھتے ۔آنکھیں دیکھنے کے بجائے دکھانے کے لیے استعمال کرتے۔لیکن اس وقت اپنے کئی خوابوں کی تعبیر میڈی کیئر ہسپتال۔سہیل یونیورسٹی۔انسٹیٹیوٹ آف ہسٹوریکل اینڈ سوشل ریسرچ کی صورت میں ہر روز اپنے سامنے دیکھ کر جو طمانت انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے وہ کسی دوسرے آپشن سے نہیں مل سکتی تھی۔

میں انہیں مبارک باد دوں گا کہ وہ ملک میں دوسرے بڑے آسودہ حال خاندانوں کی طرح اندھیرے بھی پھیلا سکتے تھے۔جس کے عوض میں انہیں جاگیریں ملتیں۔ ٹیکسٹائل ملوں کے پرمٹ دستیاب ہوتے لیکن انہوں نے چراغ طور جلایا اندھیروں کو رخصت کیا ولایت گئے تو اعلی تعلیم کے حصول کے لیے۔

اب سقوط مشرقی پاکستان کے بعد قوم کو ضرورت تھی نفسیاتی علاج کی۔اس لیے انہوں نے psychiatry کو آئیڈیل بنایا کیونکہ بیسویں صدی کے نصف میں قوم کو حکیم

الامت درکار تھے اور اب ساتویں دہائی میں ماہرین نفسیات۔ پھر جیسے جیسے ضمیر اور روحیں زخم زخم ہو رہی تھیں۔ ذہن الجھائے جا رہے تھے۔ تذبذب تشکیک تضادات دام ہم رنگ زمین کی طرح پھیلائے گئے۔ پڑھے لکھے موسیقی رقص جمہوریت اور خیال کے شیدائی بنگالی ہم سے الگ ہو گئے تو ہمیں واقعی ماہر نفسیات ہی کی ضرورت تھی۔ اس لیے تاریخ بھی انہیں علاج کا یہ شعبہ اختیار کرنے پر یاد رکھے گی۔ یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے کروڑوں کی نفسیات خراب کرنے والوں کی تحلیل نفسی کی یا نہیں۔ حکایت دل درد آشنا میں کہیں کہیں جھلکیاں تو دکھائی دیتی ہیں۔

میں تو ممنون ہوں ان کا کہ انہوں نے مجھے Psychology today کے ساتھ ساتھ Political psychology کی سبسکرپشن کا مشورہ بھی دیا۔

حیرت ہوتی ہے کہ اپنے عنفوان شباب میں ہونے کے باوجود لندن برمنگم مانچسٹر پیرس جا کر بھی یہ میڈونا سے ملے نہ برج باردوت سے اور نہ ہی جینا لولو برجڈا سے

وہاں بھی روشن خیال روشن علی بھیم جی اور پاکستان میں ذہنوں کو بیدار کرنے والے سید سبط حسن سے ہی ملتے رہے۔ کارل مارکس۔ سیگمنڈ فرائیڈ فریڈرک نشطے کی تعلیمات میں ہی کھوئے رہے۔ ورنہ گلشن میں علاج تنگی داماں بھی تھا۔

میں بہرحال انہیں مبارک باد کا ہی مستحق سمجھتا ہوں کہ برطانیہ میں جتنے اعلی جدید علوم کی تحصیل کی تربیت پائی اس کا کامیاب استعمال انہوں نے پاکستان میں غربت بیماریاں دور کرنے کے لیے کیا اور اس کے لیے پھر باقاعدہ میڈی کیئر ہسپتال جناح میڈیکل اینڈ ڈینٹل کالج اور سہیل یونیورسٹی قائم کی۔

ان کے بہت سے ہم عصر موجود ہیں جو اکسفورڈ کیمبرج پڑھ کر پاکستان واپس آئے لیکن عملا انہوں نے ایچی سن کالج اور کیڈٹ کالج پٹارو کی پڑھائی کو ہی استعمال کیا ۔ایک مبارک باد یہ بھی کہ ہر چند یہ بڑے بڑے جاگیرداروں سرمایہ داروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے رہے لیکن انھیں فکرمندی خاک نشینوں ہی کی رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ احمد فراز کی طرح انہیں یہ کہنا پڑا۔

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رک رک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

خاک نشینوں سے ان کی دردمندی میڈی کیئر ہاسپٹل میں نظر آتی رہی جب پاکستان پیپلز پارٹی قومی محاذ آزادی بلوچستان نیشنل پارٹی عوامی نیشنل پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں کے عام کارکنوں کے یہاں مفت علاج بھی میسر رہے۔

مجھے یاد ہے محترمہ بے نظیر بھٹو یہاں منور سہروردی کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لائی تھیں۔ ایک ہدیہ تبریک یہ بھی کہ انہوں نے ہسپتال میں یونیورسٹی میں اپنے لیے کروڑوں روپے خرچ کر کے اپنے پر تعیش ذاتی دفتر کی خواہش نہیں رکھی جہاں افرنگی صوفے ہوں ۔ایرانی قالین ۔چینی پارٹیشن ۔ بڑی ساری میز۔کئی لاکھ کی کرسی ۔ یہ اپنے دوسرے رفقائے کار کے ساتھ ایک ہال میں چھوٹی سی میز اور کرسی پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

آخر میں مبارک باد انسٹیٹیوٹ آف ہسٹوریکل اینڈ سوشل ریسرچ کا تحقیقی ادارہ قائم کرنے پر۔ڈاکٹر سید جعفر احمد کے تجربات مشاہدات مطالعات اور انقلابی انتظامی فکر کو گود لینے پر۔ جہاں پاکستانی سماج کی تقطیع ہوتی ہے حالات کی نبض پر انگلیاں رکھی جاتی ہیں جہاں تاریخ عوام مرتب کی جارہی ہے غیر جانبداری سے معروضی تجزیے کیے جارہے ہیں۔

ڈاکٹر طارق سہیل ماضی کو یاد رکھتے ہیں حال ایک شان سے گزارتے ہیں۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں میڈی کیئر کی بنیاد اس وقت رکھی جب شہر قائد کے لاکھوں بیماروں کے لیے صرف سرکاری ہسپتال تھے اب کووڈ کی عالمگیر وبا کے بعد تو بڑے بڑے سیٹھ میڈیا یونیورسٹی مالکان ہسپتال خرید رہے ہیں کیونکہ بیماریاں منافع

بخش ہوگئی ہیں۔ایک ایک بیمار میں لاکھوں کروڑوں کی امید دکھائی دیتی ہے۔آج کے دور میں سب سے اچھی ٹیکنالوجی لوگوں کی مجبوریوں کو اپنے لیے کیش میں تبدیل کرنا ہے۔

میں ڈاکٹر طارق سہیل ان کی رفیقۂ حیات ان کے وابستگان کو ڈاکٹر سید جعفر احمد ان کے ریسرچرز کو مبارکباد دوں گا کہ انہوں نے ایک کامیاب پاکستانی عملی زندگی کو ''حکایت دل درد آشنا'' کی دستاویزی شکل میں محفوظ کرلیا ہے۔آج کی تقریب میں اس انقلابی ہوا کے جھونکے محسوس ہورہے ہیں۔جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں چل رہی تھی۔ جب غلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی تھیں جب ابراہیم جلیس ،مخدوم محی الدین، احمد ندیم قاسمی ،احمد راہی، سجاد ظہیر، ساحر لدھیانوی، ملک راج آنند، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، شیخ ایاز، گل خان نصیر، بلراج ساہنی ،کامریڈ جمال الدین بخاری ولولۂ تازہ دے رہے تھے۔افریقہ ایشیا آزاد ہورہے تھے۔ڈاکٹر طارق سہیل ان دہائیوں کی روشن خیالیوں انقلابی جذبوں کا ایک مجسم پیکر ہیں۔

''بیا بہ مجلس اقبال یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند''

یہ الگ بات کہ آج کل تو کارپوریٹ ایگزیکیوٹو بھی سرتراشے پھرتے ہیں۔آخر میں سب سے زیادہ مسرت اور انبساط کی بات یہ کہ آج رائگانی کے دور میں ڈاکٹر طارق سہیل ایسے پاکستانی ہیں جن کی جدوجہد بے ثمر نہیں رہی انہوں نے ایک منزل کا تعین کیا اور اسے پالیا آج بھی وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔